دیتا ہوں اور میری برکت کی کوئی حد نہیں ہوتی اور جب میری نافرمانی کی جاتی ہے تو میرا غضب اترتا ہے اور جب میرا غضب اترتا ہے تو میری لعنت نافرمانی کرنے والے کی ساتویں اولاد تک پہنچتی ہے"

نیز امام احمدؒ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں انھوں نے لکھا

اما بعد! فان العبد اذا عمل بمعصیۃ عاد حامدہ ذاما

اما بعد! جب بندہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کی تعریف کرنے والے بھی اس کی مذمت کرنے لگتے ہیں۔

ابو نعیم حضرت ابو الدرداء سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہئے کہ ایمان والوں کی لعنت سے اپنے کو بچائے کیونکہ وہ اس طرح اترتی ہے کہ اس کا پتہ بھی نہیں چلتا اس کے بعد فرمایا جانتے ہو یہ کس طرح؟ میں نے کہا نہیں فرمایا جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے دلوں میں اس کی جانب سے اس طرح نفرت پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتی"

عبداللہ بن ابا احمدؒ کتاب الزہد میں روایت کرتے ہیں امام محمد سیرین کچھ قرضدار ہو گئے اور قرض کے غم میں بہت پریشان رہنے لگے۔ ایک دن فرمانے لگے اس غم اور پریشانی کا سبب مجھے معلوم ہے یہ اس گناہ کا نتیجہ ہے جو آج سے چالیس سال پیشتر مجھ سے سرزد ہوا تھا۔

یہاں ایک باریک نکتہ ہے جو نہایت قابل غور ہے اور جس کے سمجھنے میں عموماً غلطی لوگوں نے کی ہے اور وہ یہ کہ گناہ کی تاثیر فوراً نظر نہیں آتی۔ اور بندہ گناہوں کو بھول جاتا ہے اور پھر خیال کرنے لگتا ہے کہ گناہ کا اثر کچھ باقی نہیں رہا اور اس شعر کے مطابق اس کے خیالات ہو جاتے ہیں

اذا لم یغیر حائطا نی وقوعہ فلیس لہ بعد الوقوع غبار

جب کھڑی دیوار غبار آلود نہیں ہوتی تو گر جانے کے بعد وہ کیا غبار آلود ہوگی

اللہ۔ اللہ! اس دقیق نکتہ سے بے خبری کی وجہ سے خدا کی کتنی مخلوق ہلاک و برباد ہو گئی اور بڑی بڑی نعمتوں سے خدا کے بندے محروم ہو گئے؟ اور کیسے کیسے عذاب اپنے سروں پر اٹھائے

بڑے بڑے علماء فضلاء دھوکہ کھا گئے۔ جاہلوں اور احمقوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے یہ فریب خوردہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ عرصہ کے بعد بھی گناہوں کا پھوڑا پھوٹے بغیر نہیں رہتا۔ سنان وسیف کا زخم بھر جاتا ہے۔ مگر معمولی سی بے اعتدالی اور بدپرہیزی اسے تازہ کر دیتی ہے۔

امام احمدؒ۔ حضرت ابوالدرداء سے روایت کرتے ہیں "اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہو اور اپنے کو مردہ سمجھو اور یہ سمجھ لو کہ تھوڑا سا جو نہیں کافی ہو جائے غفلت میں ڈالنے والے کثیر سے بہتر ہے۔ اور سمجھ لو نیکی پرانی نہیں ہوتی اور گناہ کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے۔"

کسی بزرگ نے ایک خوبصورت لڑکے کو دیکھا اور اس کی خوبصورتی پر کچھ دیر غور کرتے رہے جب رات کو سو گئے تو خواب میں وہ لڑکا ان کے سامنے آیا۔ اور کہنے لگا اس کا انجام تم چالیس سال کے بعد دیکھو گے۔

گناہوں کا اثر گو بدیر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کا کچھ نہ کچھ اثر فوری طور پر ضرور ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان تیمی کہتے ہیں۔ انسان رات کو مخفی طور پر گناہ کرتا ہے لیکن صبح کو وہ اس حالت میں اٹھتا ہے کہ اس کی ذلت اس کے سر پر سوار ہوتی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی کہتے ہیں۔ مجھے اس عقل مند پر تعجب ہوتا ہے جو یہ دعا مانگتا ہے اَللّٰھُمَّ لَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ: اے اللہ دشمنوں کو مجھ پر نہ ہنسا) لیکن افسوس وہ خود اپنے دشمنوں کو اپنے اوپر ہنساتا ہے۔" کسی نے پوچھا یہ کیوں کر؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے جس سے قیامت کے دن یقیناً اس کی ہنسی ہوگی۔

ذوالنون فرماتے ہیں جو شخص چھپ چھپا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کرے گا۔ اللہ اس کو ظاہر کر دے گا اور اس کا راز فاش کر دے گا۔

التقریظ والانتقاد

"جامع المجددین"

از

سعید احمد

(۳)

لائق مولف نے حضرت مولانا تھانویؒ کے اوصاف شماری میں جس مبالغہ اور غلو سے کام لیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ مولانا مرحوم کے اُن ارشادات کے منافی ہے جو آپ نے مریدوں کے آداب کے ذیل میں بیان فرمائے ہیں بلکہ مولانا کے اُن بعض ارشادات کے بھی خلاف ہے جن میں مولانا نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مثلاً جناب مولف کا دعویٰ یہ ہے کہ "علم وعمل میں حدود کی رعایت اس درجہ تھی کہ .... لوازم بشریت کے ساتھ اس سے زاید کا تصور دشوار ہے" (ص ۴) فلسفۂ اخلاق کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ علم وعمل میں حدود کی اس انتہائی رعایت کا مقام کسی شخص کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کی تینوں باطنی قوتوں یعنی قوت نظری قوت غضبی اور قوت شہوی میں اعتدال پایا جائے جب ان تینوں قوتوں میں اعتدال پیدا ہوتا ہے تو اس سے فضائل پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کے مجموعہ سے نتیجۃً فضیلت عدالت پیدا ہوتی ہے جو انسانی شرف ومجد کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز ہے اور انسانی کمالات میں جو فرق مراتب پایا جاتا ہے وہ بھی ان مذکورہ بالا قوتوں کے اعتدال کی کمی اور زیادتی پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم وعمل میں حدود کی اس انتہائی رعایت کا مقام اسی وقت میسر آسکتا ہے جب کہ کسی ایک قوت میں نہیں بلکہ تمام قوتوں میں یکساں اعتدال پایا جائے۔ اگر دو قوتوں میں اعتدال ہے اور تیسری میں نہیں تو اور جو کچھ بھی ہو مگر یہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔ اب اس تمہید کے بعد حضرت مولانا تھانوی کے ارشادات ذیل ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) عقد ثانی کے واقعہ پر اپنے تاثرات و احساسات بیان فرماتے ہوئے ارشاد کرتے ہیں "حلم و تحمل کا ذوق نہ تھا (صفحہ ۴۳)

(۲) ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "احقر مدتوں سے اپنے متعلقین کو ایسے مواقع پر زبانی احتساب کرتا رہتا ہے۔ گو اس میں اتنی خطا ضرور ہے کہ بعض وقت مزاج میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔"

مولانا مرحوم کو خود اس کا احساس ہے کہ مزاج میں یہ حدت محمود نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ معاف کر کے اصلاح فرما دے" (ص ۵۰۲)

فلسفۂ اخلاق کے کسی مبتدی سے پوچھئے وہ بتائے گا کہ حلم و تحمل کے ذوق کا نہ ہونا اور مزاج میں حدت، یہ نتیجہ ہوتا ہے قوت غضبی میں اعتدال کے نہ ہونے کا۔ پس جب ایک قوت میں اعتدال نہیں ہو گا تو فضیلت عدالت کی شرط نہ پائی جائیگی اور جب عدالت نہ ہو گی تو ہمارے مولف نے جو مقام تجویز کیا ہے وہ کیونکر حاصل ہو گا؟ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصد حاشا وکلا حضرت تھانوی کی تنقید اور ان کا استخفاف نہیں۔ بلکہ صرف مولف کے قلم اور ان کے فکر و نظر کی کجروی پر تنبیہ مقصود ہے اس لئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں ایک چیز کا اور بیان کر دینا ضروری ہے جو قارئین کے لئے انتہائی عبرت آموز بھی ہو گی اور دلچسپ بھی۔

حضرت تھانوی اپنی دونوں بیگمات کے درمیان جو عدل قائم رکھتے تھے وہ ایک امر واقع ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اپنے بعض خصائل و خصائص کی طرح وہ اس میں بھی بہت ممتاز تھے۔ لیکن جناب مولف نے اُس کو جس آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے اسے دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ فلسفہ کا ایک استاد سابق تو درکنار کیا کوئی معمولی درجہ کی سمجھ رکھنے والا بھی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

کہ اہتمام کی انتہا یہ تھی کہ ایک (بیوی) کی باری میں دوسری بیوی کا خیال لانا بھی خلاف
جس کی باری ہے اس کی طرف توجہ میں کمی ہو گی۔ جو حق تلفی ہے"

اس کے بعد مولانا تھانوی کا ایک واقعہ لکھکر دوسروں پر چھینٹے اڑانے اور کچھ کے لگانے کی جو خو مولف نے پیدا کر لی ہے اُس کے مطابق فرماتے ہیں "بھلا یہاں تک ذہن بھی کس کا جا سکتا ہے سوائے

اس کے جو اپنے قلب کی ہر جنبش کی نگرانی کرتا اور ہمہ وقت اپنے کو حق تعالیٰ کے حضور میں پاتا اور اس کو حاضر و ناظر جانتا ہو" (ص ۱۶۰)

غور کیجئے جناب مولف نے حضرت تھانوی کے انتہائی عدل بین الزوجتین کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ عقلی، منطقی اور نفسیاتی طور پر کس قدر غلط اور بے معنی ہیں۔ اور ساتھ ہی اس سے کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہوتی ہے۔ عقلی منطقی اور نفسیاتی طور پر اس کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی خیال پر کبھی روک ٹوک نہیں لگائی جاسکتی اس پر ہرگز پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔ یعنی آپ کسی خیال کی نسبت لاکھ عہد کریں کہ ایسے اپنے دل یا دماغ میں گھسنے ہی نہ دیں گے آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دماغ میں خیال کے در آنے کے بیشمار دروازے ہیں آپ کے فکر و شعور کی دسترس سے باہر ہیں۔ کسی شے کا خیال آنے کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ کو اس شے سے کتنا تعلق ہے۔ جتنا تعلق ہوگا بس اسی کے مطابق خیال کی آمد و رفت ہوگی۔ خواہ آپ کو اُس خیال سے راحت ہو یا تکلیف۔ آپ اُس سے خوش ہوں یا مغموم، آپ جسمانی طور پر یا دماغی اعتبار سے کسی امر میں کتنے ہی مصروف ہوں۔ بہرحال خیال کے آنے کے دروازے بند نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ رات کی خاموشیوں میں جبکہ آپ کے حواس کی مملکت پر نیند کا قبضہ ہو جاتا ہے آپ کی قوت متخیلہ اس وقت بھی بیدار رہتی ہے اور اس کھڑکی کے ذریعہ دماغ میں خیالات کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

ذکرتك والخطی یخطر بیننا وقد نهلت منا المثقفة السمر

ترجمہ:۔ پیاری۔ میں نے تجھکو اس وقت بھی یاد کیا جب کہ گندمی رنگ کے تیز دھار والے خطی نیزے (میدان جنگ میں) ہمارے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے اور کھٹا کھٹ چل رہے تھے۔

اس خیال کے آنے میں نہ میلوں اور کوسوں کی بُعد مسافت حائل ہوتی ہے اور نہ زندان و محن کی اونچی اور آہنی دیواریں۔

خیال لام السلسبیل ودونها مسیرة شهر للبرید المذبذب

ترجمہ:۔ میری محبوبہ ام سلسبیل کا خیال میرے پاس آتا ہے۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان

میں ایک تیز رفتار قاصد کی ایک مہینہ کی مسافت حائل ہے۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے۔ عجبت لسراھا وانی تخلصت ؛ الی وباب السجن دونی مغلق

ترجمہ :۔ میری محبوبہ کا خیال معلوم نہیں کس طرح میرے پاس چلا آیا۔ جبکہ قید خانے کا دروازہ میرے اوپر بند تھا۔

اس بنا پر مولف کا یہ دعوٰی کہ حضرت تھانوی ایک بیوی کی باری میں دوسری بیوی کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتے تھے سرتا سر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں کہ یا تو مولانا تھانوی کی طرف اس خیال کی نسبت صرف جناب مولف کا اختراع فائقہ ہے۔ اور اس لئے ہے کہ مولانا کو ایک مافوق الفطرت ہستی ثابت کیا جائے۔ اور یا اگر یہ انتساب صحیح ہے تو پھر خود مولانا پر الزام آتا ہے کہ جو چیز انسان کے بس میں ہی نہیں ہے اُس کے وجود میں آنے کو وہ کس طرح خلاف عدل اور عند اللہ قابل مواخذہ سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ کا تصور اور اُس کا خیال بھی شریعت میں نہ گناہ ہے اور نہ قابل مواخذہ تو پھر اپنی ایک رفیقۂ حیات کا خیال کس طرح خلاف عدل (گناہ) ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ جناب مولف کے خیال میں غالباً حضرت مولانا تھانوی کے فضل و کمال کا اعتراف اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ایک نہایت معصومانہ انداز میں دوسرے حضرات پر فقرے نہ کسے جائیں اور ان پر طنز و تعریض نہ کی جائے لیکن نہایت افسوس اور بڑی شرم کی بات ہے کہ اس موقع پر وہ حبك الشئ یعمی ویصم کے مطابق اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تنقیص کر بیٹھے ہیں۔ تاریخ و سیر اور احادیث کی کتابوں میں صاف طور پر مذکور ہے کہ ... حضرت خدیجہ کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ آپ دوسری بیویوں کی باری کے دنوں میں اکثر ...زو گداز کے ساتھ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ اُس سے ازدواج مطہرات کو ...ی تنگ ہو جاتی تھی۔ حضرت خدیجہ کے بعد آپ کو حضرت عائشہ سے محبت تھی اور حضرت عائشہ بھی اسے جانتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود فرماتی ہیں کہ "میں نے خدیجہ کو نہیں دیکھا لیکن

مجھکو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا ——— اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے اسپر اپنی آزردگی کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ خدا نے مجھکو ان کی محبت دی ہے" (صحیح مسلم فضائل خدیجہ) غور کیجئے مولانا تھانوی کے نزدیک تو دوسری بیوی کا خیال لانا بھی خلاف عدل ہے۔ لیکن یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف خیال ہی نہیں لاتے ہیں بلکہ ذکر بھی فرماتے ہیں۔ اور ذکر بھی ایک دو دفعہ نہیں۔ بھول چوک سے نہیں بلکہ ہمیشہ اور عمداً قصداً۔ اور ذکر بھی زندہ بیوی کا نہیں بلکہ مرحومہ کا۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ سننے والی بیویوں کو اس سے آزردگی نہ ہوتی ہو۔ نہیں بلکہ انہیں آزردگی بھی ہوتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ لیکن پیغمبر کا کیرکٹر یہ ہے کہ جو بات ہے آئینہ کی طرح صاف ہے۔ اور سورج کی طرح روشن ہے۔ آپ صاف فرماتے ہیں کہ مجھکو ان سے محبت ہے" اور صرف اسی پر بس نہیں ہے بلکہ آپ اس کے فضائل و محامد اور وجوہ ترجیح بھی بیان فرماتے ہیں جو ایک سوکن کے لئے مزید ناگواری کا باعث ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ ان کی بہن ہالہ سیدہ لولاک سے ملنے آئیں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔ ان کی آواز حضرت خدیجہ کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ آنحضرت نے سنی تو فوراً حضرت خدیجہ یاد آگئیں۔ ارشاد ہوا کہ ہالہ ہونگی!" حضرت عائشہ پاس بیٹھی تھیں انہیں رشک ہوا اور بولیں " آپ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں حالانکہ خدا نے آپ کو ان سے اچھی بیویاں دی ہیں؟" جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ہرگز نہیں جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں اور جب میرا کوئی مددگار نہیں تھا تو انہوں نے میری مدد کی (استیعاب)

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ سے بہت محبت تھی۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں کثرت سے واقعات مذکور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ حدیث ہے کہ مرض الوفات میں آپ کسی دوسری بیوی کے گھر میں مقیم تھے کہ دریافت فرمایا " کل میں کس کے گھر میں رہوں گا؟ ازواج مطہرات منشاء مبارک سمجھ گئیں۔ سب نے کہا کہ آپ جہاں

چاہیں قیام فرمائیں۔ وقت آگیا تھا کہ یہ خاکدانِ عالم آفتاب نبوت کے جسد عنصری سے محروم ہو جائے اس لئے ضعف اس درجہ ہو گیا تھا کہ خود چل نہیں سکتے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بہ مشکل حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں لائے اور بالآخر ایک ہفتہ یہاں قیام فرمانے کے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے" غور کرو کتنا نازک مقام ہے۔ سید کونین کی اس دنیا سے رحلت کا وقت آگیا ہے۔ ایسے موقع پر ہر رفیقۂ حیات کی طبعی طور پر خواہش ہو سکتی تھی کہ آپ کی وفات اسی کے حجرہ میں ہو۔ تاکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اُسے زیادہ سے زیادہ کسب سعادت کا شرف حاصل ہو اور پھر دوسری بیویوں کا دن بھی ہے۔ لیکن انحضرتؐ کے دل میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ غیر معمولی محبّت کی وجہ سے اس وقت جو آرزو ہے آپ اس کو پوشیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن غایت خلق و کرم کے باعث زبان اشارہ سے اس کا اظہار فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قلبی تعلق تھا آپ اس کو چونکہ ازواج مطہرات سے یا کسی اور سے چھپاتے نہیں تھے۔ بلکہ مختلف طریقوں سے اظہار ہوتا رہتا تھا۔ اس بنا پر ازواج مطہرات کو ناگواری ہوتی تھی اور کبھی حضرت فاطمہ کو اور کبھی حضرت زینب کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کی غرض سے بھیجتی تھیں۔ چنانچہ ایک دفعہ جناب سیدہ فاطمہؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ حضرت عائشہؓ کو دوسری ازواج پر کیوں ترجیح دیتے ہیں تو صاف ارشاد ہوا کہ بیٹی! کیا جس کو میں چاہتا ہوں تم اس کو نہیں چاہتیں؟ حضرت فاطمہؓ چپ ہو گئیں اور ازواج مطہرات سے جا کر کہا کہ میں اب آئندہ اس معاملہ میں دخل نہیں دوں گی!

غور کرو ان سب واقعات سے کیا ثابت ہوتا ہے! یہی ناکہ دل میں خیال کا لانا گیا۔ آنحضرتؐ وسلم ایک بیوی کی باری میں دوسری حرم محترم کا ذکر تک کرتے تھے اور ان کے ساتھ رفرماتے تھے۔ آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ اس سے دوسری بیویوں کو اذا رضت احدٰہما کے مطابق طبعی طور پر ناگواری ہوتی ہے لیکن عدل انہیں چیزوں میں ہو سکتا ہے جو انسان کے خود اپنے اختیار میں ہو۔ اور محبت چونکہ غیر اختیاری چیز ہے کہ (لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے)

اس بنا پر اس میں عدل کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تاہم کمال عبدیت کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات میں عدل فرماتے تھے اور ساتھ ہی دعا کرتے تھے کہ

اللھم ھذہٖ قسمتی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک (ترمذی باب کاجاء فی التسویۃ بین الضرائر)

اے اللہ یہ میری تقسیم ان چیزوں میں ہے جن کا میں مالک ہوں۔ پس تو مجھکو ملامت نہ کر ان چیزوں میں جن کا کہ تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں!

اب اس کے بالمقابل جناب مولف کا یہ بیان پڑھئے کہ مولانا تھانوی ایک بیوی کی باری میں دوسری بیوی کا خیال لانا خلاف عدل سمجھتے تھے" اور بتائیے کہ العیاذ باللہ اس جملہ کا حاصل یہ نہیں ہے کہ اس معاملہ میں مولانا تھانوی کا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اونچا ہے کہ جو کام آپ نہ کر سکے وہ مولانا نے کر کے دکھا دیا۔ پھر مولانا عبد الباری ندوی فرماتے ہیں کہ مذکورۂ بالا جملہ کے بعد انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "بھلا یہاں تک ذہن بھی کس کا جا سکتا ہے الخ" تو اس کی زد کس پر پڑ رہی ہے

"وائے گر در پس امروز بود فردائے"

تعدد ازدواج اور شوہر کا دستور العمل

اور سنئیے! حضرت مولانا تھانوی نے غالباً عقد ثانی کے بعد اپنے ذاتی تجربات سے متاثر ہو کر تعدد ازدواج کے مسئلہ پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا ہے جس میں تعدد ازدواج کو ہر روایتی صراط مستقیم کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز بتایا گیا ہے اور یہاں تک فرما دیا ہے کہ "من نکردم شما حذر بکنید" (ص ۴۲۲) پھر آگے چلکر اس میں جو قباحتیں دشواریاں اور صعوبتیں ہیں ان کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں "تعدد میں پڑنا یا تو دنیا برباد و تلخ کرنا ہے اور یا آخرت و دین کو تباہ کرتا ہے (ص ۴۲۹) اس سلسلہ میں ہماری گذارش یہ ہے کہ بے شبہ ہوس رانی اور لذت نفس کے لئے خواہ مخواہ تعدد ازدواج کی راہ اختیار کرنا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پسندیدہ نہیں ہے۔ لیکن یہ چیز اس درجہ قبیح اور لائق اجتناب بھی نہیں ہے جتنی کہ مولانا کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ خود صحابہ کرام میں کثرت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو ایک سے زائد بیویاں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی اس قدر آبادی میں

ایک حد تک دخل تعدد ازدواج کو بھی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ تم دلود ودود عورتوں سے شادی کرو تاکہ میں تمہاری وجہ سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں فخر کروں یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کثرت آبادی کو بھی قومی طاقت وقوت کے پیدا کرنے میں دخل ہے۔ اس بنا پر آبادی میں اضافہ کے جو اسباب ہوں گے وہ بھی محمود ہوں گے۔ بہرحال اس کا دارو مدار حالات وظروف اور شخصی وقومی مصالح پر ہے ان مصالح کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر شخصی اعتبار سے تعدد ازدواج کبھی واجب ہوگا۔ کبھی مستحب۔ کبھی مباح۔ اور کبھی مکروہ۔ اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ حضرت مولانا تھانوی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت ذرا وسعت نظر سے کام لیتے اور شخصی نفع وضرر کے علاوہ قومی مفاد و مضار اور اجتماعی مصالح وحِکَم کو بھی پیش نظر رکھتے۔ خیر یہ مسئلہ تو اپنی جگہ الگ بحث ونظر کا محتاج ہے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی قباحتوں کو بیان فرمانے کے بعد مولانا نے ان لوگوں کے لئے جو اس میں مبتلا ہو ہی جائیں ایک دستور العمل بھی لکھا ہے جس میں شوہر کو آپ نے بارہ ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے تین ہدایتیں ۷، ۸۔ ولمبر ۹ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک کے ساتھ محبت کا اظہار دوسرے کے سامنے نہ کرے

(۲) ایک کی تعریف دوسری سے نہ کرے۔

(۳) غرض ایک کا تذکرہ دوسری سے نہ کرے (ص ۴۳۴)

اب آپ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ان ہدایات کو ملاحظہ فرمائیے اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے جو بعض واقعات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ

(۱) ایک کے ساتھ محبت کا اظہار دوسری کے سامنے کرتے تھے

ایک کی تعریف دوسری سے کرتے تھے۔

یک کا تذکرہ بھی دوسری سے کرتے تھے۔ اب فرمائیے آپ کس کو حق اور قابل اتباع قرار دیں فاضل مؤلف کا مولانا تھانوی کی مذکورۂ بالا ہدایات کے متعلق ارشاد علی الاطلاق یہ ہے کہ نسخوں کے مجرب وتیر بہدف ہونے میں شبہ نہیں ہر ہر جزء حکیمانہ وعارفانہ ہے" (ص ۴۳۵) اگر جناب

مؤلف کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو وہ بتائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان کا ارشاد کیا ہوگا ؟

ایک تنبیہ اس موقع پر ہمارے اعتراض کی نوعیت سے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ مولانا تھانوی نے جان بوجھ کر اسوہ و سیرت نبوی کے خلاف یہ ہدایات دی ہیں بلکہ مولانا دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ذاتی طور پر یہ ہے لیکن چونکہ آپ نے اس بارہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی ہے اس بنا پر عام مصالح کے پیش نظر مولانا کو یہ رائے دینے کا حق حاصل ہے کہ مسلمانوں کو اپنے معاملات میں کیا کرنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک مولانا کا یہ نقطۂ نظر درست ہے اور اس بنا پر جہاں تک رائے اور مشورہ کا تعلق ہے مولانا پر اعتراض کی گنجائش نہیں البتہ اعتراض اور شکایت جو کچھ بھی ہے وہ جامع المجددین کے مؤلف سے ہے ان کو یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ مولانا تھانوی جو کچھ فرماتے ہیں وہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے متصادم تو نہیں ہے اگر متصادم ہے اور یقیناً ہے تو پھر ان کو مولانا تھانوی کے مشورہ سے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھنے چاہئیں تھے جو انھوں نے لکھے ہیں کیونکہ ان الفاظ کی زد سیرت نبوی پر پڑتی ہے۔

صفحات گذشتہ میں ہم نے مولانا تھانوی کے بعض واقعات پر جو نکتہ چینی کی ہے اس کی نوعیت اور حیثیت بھی یہی ہے یعنی ہر بزرگ کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص افتاد طبع ہوتی ہے اس کے مطابق اس سے مختلف اعمال و افعال کا صدور ہوتا ہے اسی طرح بزرگوں پر خاص خاص حالات میں مختلف رنگ اور مختلف قسم کے احوال و کیفیات طاری ہوتے ہیں اور ان کے زیر اثر ان سے قولاً و عملاً مختلف قسم کی چیزیں صادر ہوئی ہیں۔ ایک سلیم الطبع مرید کا یہ فرض ہے کہ ان سب چیزوں کو قرآن و سنت کے معیار پر جانچے اور پرکھے اگر دونوں میں مطابقت ہو تو اس کو بے تکلف نقل کر دے اور اگر مطابقت نہ ہو تو اسے خاموش رہنا چاہئے اس وقت اس کے لئے نہ یہ مناسب ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے مرشد پر نکتہ چینی کا اور تقبیح و مذمت کا ذریعہ بنائے اور نہ اس کے لئے کسی طرح یہ جائز ہوگا کہ اپنے مرشد کے قول و عمل کو اسوہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے اور اس بات کا اعلان کرے کہ بس اس کے مرشد نے جو کیا ہے وہ ہی حق ہے وہ ہی صواب ہے اور وہ ہی اسوہ ہے اور اس کے علاوہ کسی عالم کسی شیخ اور کسی بزرگ

کا بھی جو عمل ہے وہ لائق مذمت ہے اور قابل نفرت اگر جامع المجددین کے مصنف نے یہ ہی نقطۂ نظر سامنے رکھا ہوتا تو مولانا تھانوی کے گذشتہ واقعات مثلاً نواز جنگ کو ان کے خط پر تنبیہ کرنا۔ خانقاہی مہمانی کو بند کر دینا بغیر اذن سابق کے دیوان خانہ میں شب باش ہو جانے پر باز پرس کرنا۔ مہمان کے اپنے کھانے پر دوسرے کو شریک کر لینے پر اس سے جواب طلب کر لینا ان سب کو وہ اس طرح پیش کرتے جس سے یہ معلوم ہوتا کہ مولانا جزئی سے جزئی اور معمولی سے معمولی بات کا بھی خیال رکھتے تھے اور چونکہ مزاج میں تشدد تھا اس لئے مریدین و معتقدین سے ادنیٰ فروگذاشت پر بھی کڑی باز پرس فرماتے تھے اور بس! اسی طرح عقد ثانی سے متعلق مولانا نے جو اپنے تاثرات بیان فرمائے ہیں لائق مؤلف کو سمجھنا چاہتے تھا کہ ان کی حیثیت ایک شخصی تاثرات کی ہے جو اس قسم کے مواقع پر ہر صاحب معاملہ کے دل میں پیدا ہو ہی جاتے ہیں ان تاثرات کو اولاً تو سرے سے جگہ ہی نہ دینی تھی اور اگر جی ان کے ذکر کے لئے ایسا ہی بے تاب ہو رہا تھا تو ان کو ان کے اصل رنگ میں پیش کرنا چاہئے تھا ضرورت نہ تھی کہ انھیں رموز شریعت و طریقت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا لیکن یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ قرآن و سنت اصل کسوٹی اور معیاری حیثیت سے سامنے ہوں اور ایک بلند پایہ بزرگ کو صرف اس کے اسی مرتبہ و مقام تک محدود رکھنے کا جذبہ ہو اس کے برخلاف اگر پہلے سے یہ مان لیا گیا ہے کہ اس بزرگ کو جامع المجددین ہی ثابت کرنا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ جو بھی بے اعتدالی ہو اور اس بے اعتدالی کی زد میں اکابر مشائخ و علما کا کیا ذکر پیغمبر اور پیغمبر کے ساتھی بھی آجائیں تو ذرا مستبعد نہیں۔

اے کاش لائق مصنف کو معلوم ہوتا کہ کمبخت شیطان کے راہ مارنے کے طریقے ایک نہیں ہزاروں ہیں کبھی یہ بدی کے راستہ پر لگا کر انسان کو خسر فی الدنیا والاخرۃ کا مصداق بناتا ہے اور کبھی نیکی میں غلو پیدا کر کے اسے راہ سے بے راہ کر دیتا ہے کبھی خدا اور مذہب کا منکر بنا کر ہلاک عبادات میں اس درجہ انہماک پیدا کر کے آخرت خراب کر دیتا ہے کہ انسان حقوق العباد کے حق سے غافل ہو کر احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے لگتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ حج کر کے حجرہ سے باہر تشریف

لائے تو دیکھا کہ زمین سے آسمان تک نور ہی نور ہے حضرت نے پوچھا من انت تو کون ہے آواز آئی انا ربک میں تیرا رب ہوں حضرت بایزید نے کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ نور فوراً منتشر ہونے لگا اور اس سے آواز آئی کہ بایزید آج تمہارے علم نے تم کو بچا لیا ورنہ یہی حربہ ہے جس سے میں نے سینکڑوں عابدوں کی عبادت کو برباد کر دیا ہے اب حضرت نے پھر لاحول پڑھی اور بولے کم بخت! یہ تیرا دوسرا حربہ ہے میں ہرگز اپنے علم پر ناز نہیں کروں گا۔ بلکہ یہ صرف خدا کا فضل و کرم ہے جس نے مجھ کو تیرے دام تزویر سے بچا دیا فالحمد للہ علی ذالک حضرت شاہ حاجی امداد اللہ صاحب۔ مہاجر مکی نے اپنی کتاب غذائے روح میں ایک فاسق عالم زادہ اور جاہل عابد کا قصہ لکھا ہے کہ یہ عابد اپنی ایک آنکھ پر ہمیشہ پٹی باندھے رکھتا تھا اور ساتھ ہی ناک میں کسی نجس چیز کی ایک بتی رکھتا تھا۔ اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو بولا کہ قرآن مجید میں فضول خرچی اور اسراف کی مذمت کی گئی ہے اور چونکہ دیکھنے میں ایک آنکھ بھی وہی کام کرتی ہے جو دونوں آنکھیں کرتی ہیں اس لئے دوسری آنکھ سے کام لینا فضول خرچی ہے۔ رہی بتی تو بات یہ ہے کہ روحانیت پیدا کرنے کے لئے نفس کشی ضروری ہے اور چونکہ میرا نفس عطر و خوشبو کا بہت دلدادہ ہے اس لئے اسے مارنے کے لئے اس کی ضد میں میں نے یہ بدبودار بتی رکھ چھوڑی ہے۔ یہ عابد سالہا سال سے اسی معمول کا پابند تھا۔ اور کوئی اسے بتانے والا نہیں تھا کہ وہ کس گمراہی میں مبتلا ہے۔ آخر فاسق عالم زادہ کی اور اس عابد کی جب ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اور شرعی مسئلہ کیا ہے؟

ایک سوال اور اس کا جواب یہاں مسئلہ زیر گفتگو سے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور بنیادی اعتبار سے سبق آموز بھی، سوال یہ ہے کہ اچھا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواج مطہرات کے ساتھ جو معاملہ تھا جس کا اوپر ذکر ہوا وہ سنن عادیہ کے تحت میں داخل ہے اور اس بنا پر اس کا اتباع شرعاً واجب نہیں اور اسی وجہ سے مولانا تھانوی یا کسی دوسرے بزرگ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاص مصالح کے پیش نظر اس کے خلاف عمل کرنے کا مشورہ دیں۔ لیکن آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور مولانا تھانوی کے مشورہ میں تضاد کی وجہ کیا ہے؟ بہ ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کے ارشاد